Article

The Role of Urdu Language in Promoting National Unity: A Research Study

قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو زبان کا کردار: ایک تحقیقی مطالعہ

Ali Raza*[1], Dr. Azeemullah Jundran [2]
[1]MS Scholar, Department of Urdu, The Superior University, Lahore. [2]Assistant Professor, Department of Urdu, The Superior University, Lahore.

علی رضا[1]، ڈاکٹر عظیم اللہ جندران[2]

[1] ایم ایس اسکالر، شعبہ اردو، دی سپر یئر یونیورسٹی لاہور، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، دی سپر یئر یونیورسٹی لاہور

eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813

This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Copyright: © 2025 by the authors.

Abstract:
Urdu language serves as a vital bridge of national integration and provincial unity in Pakistan. This research article explores the profound linguistic connections between Urdu and the regional languages of Sindh, Punjab, Balochistan, Khyber Pakhtunkhwa, and Kashmir. By analyzing theories from prominent scholars like Syed Sulaiman Nadvi and Mahmud Shairani, the study establishes that Urdu is not an alien language but a common heritage derived from .the socio-cultural and linguistic synthesis of all Pakistani regions The article highlights the role of Sufis and institutional efforts in fostering a unified national identity through Urdu. It concludes that the survival of Pakistan's federal structure is deeply linked to the promotion of Urdu as a medium of communication that respects and absorbs the richness of regional dialects.

Keywords:
,National Integration, Urdu Linguistics, Regional Languages Pakistan Culture, Linguistic Synthesis, Provincial Unity, Common Heritage, Socio-Linguistic Relations.

اردو زبان محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک ایسی تہذیبی اکائی ہے جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ پاکستان کی تخلیق کے پسِ پردہ جہاں مذہبی اور سیاسی عوامل کارفرما تھے، وہاں اردو زبان نے ایک ایسے لسانی پُل کا فریضہ سرانجام دیا جس نے مختلف جغرافیائی خطوں میں بسنے والے گروہوں کو "پاکستانیت" کے ایک مرکز پر جمع کر دیا۔ یہ زبان کسی ایک

مخصوص علاقے کی اجارہ داری نہیں بلکہ پاکستان کے تمام صوبوں کے مشترکہ لسانی اور تہذیبی ورثے کا نچوڑ ہے۔ سندھ کی وادیوں سے لے کر خیبر کے پہاڑوں تک اور بلوچستان کے صحراؤں سے کشمیر کے مرغزاروں تک، اردو نے مقامی بولیوں سے اثرات قبول کیے اور انہیں اپنے دامن میں سمیٹا۔ یہی اخذ و انجذاب کی صلاحیت اردو کو قومی یکجہتی اور وفاق کی علامت بناتی ہے۔ زیرِ نظر مطالعہ میں پاکستان کے مختلف خطوں کے ساتھ اردو کے گہرے لسانی روابط اور ان کے اشتراک کا علمی جائزہ لیا گیا ہے۔

اردو زبان کے تشکیلی عناصر اور اس کی ابتدائی ساخت کا مطالعہ ہمیں وادیِ سندھ کے اس وسیع و عریض جغرافیائی خطے کی طرف لے جاتا ہے جسے تاریخ میں "بابِ اسلام" کا درجہ حاصل ہے۔ جب آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں عرب فاتحین اس خطے میں وارد ہوئے، تو یہاں کے قدیم تمدن اور فاتحین کی حجازی ثقافت کے مابین ایک ایسا نامیاتی ملاپ ہوا جس نے نہ صرف سماجی بلکہ لسانی سطح پر بھی ایک نئے انقلاب کی بنیاد رکھی۔ اس دور میں سندھ کی حدود محض موجودہ صوبے تک محدود نہیں تھیں بلکہ ملتان سے لے کر ٹھٹھہ کے ساحلوں تک کا پورا علاقہ ایک ہی انتظامی و تہذیبی اکائی میں پرویا ہوا تھا۔ مقامی باشندوں کی قدیم پراکرتوں اور عربوں کی فصیح زبان کے اس اختلاط نے ایک ایسی کھچڑی زبان کو جنم دیا جس کے پیٹ میں عربی کے ٹھوس الفاظ اور مقامی بولیوں کا صوتی آہنگ رچ بس گیا تھا۔ یہی وہ ابتدائی صورت تھی جسے ماہرینِ لسانیات اردو کا "قدیم ہیولیٰ" قرار دیتے ہیں۔

اس لسانی نظریے کے سب سے بڑے علمبردار سید سلیمان ندوی ہیں، جنہوں نے تاریخی حقائق اور جغرافیائی شواہد کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ اردو کی آبیاری کا پہلا مرحلہ دہلی یا پنجاب نہیں بلکہ وادیِ سندھ کی وہ زرخیز زمین تھی جہاں اسلامی تہذیب کا پہلا نقش ثبت ہوا تھا۔ ان کے نزدیک زبان کی تشکیل محض سیاسی عمل نہیں بلکہ ایک طویل سماجی تعامل کا نتیجہ ہوتی ہے جو سندھ میں مسلمانوں کی مستقل سکونت پذیری کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ اس تشکیلی عمل کی قدامت اور اہمیت کو واضح کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:

> "مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے اور قرینِ قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں۔ اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہو گا۔۔۔ جس کی حد اس زمانے میں ملتان سے لے کر بھکر اور ٹھٹھہ کے سواحل تک پھیلی ہوئی تھی۔"(1)

وادیِ سندھ کا یہ لسانی فیضان محض زبانی بول چال تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے بہت جلد علمی و ادبی پیرایہ بھی اختیار کر لیا تھا۔ منصورہ اور ملتان کے علمی مراکز میں ایسے نابغہ روزگار علماء پیدا ہوئے جنہوں نے عربی، فارسی اور مقامی "ہندوی" زبانوں پر بیک وقت دسترس حاصل کی۔ تاریخ میں اس کا سب سے مستند حوالہ دسویں صدی عیسوی کے اس قصیدے اور تفسیرِ قرآن کی صورت میں ملتا ہے جو ایک عراقی نژاد عالم نے کشمیر کے راجہ کی فرمائش پر سندھ میں بیٹھ کر "ہندی زبان" میں ترتیب دی تھی۔ یہ واقعہ اس حقیقت کا بین ثبوت

ہے کہ محمد بن قاسم کی آمد کے ڈیڑھ دو سو سال کے اندر ہی سندھ میں ایک ایسی مشترکہ زبان وجود پا چکی تھی جو مذہبی اور قانونی اصطلاحات کی تفہیم کے لیے "ہندوی" یا "ہندی" کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ اس عہد کی لسانی وسعت کی گواہی بزرگ بن شہریار کے ان الفاظ سے ملتی ہے:

"ان یفسر لہ شریعۃ الاسلام بالہندیہ" یعنی شریعتِ اسلام کا ہندی میں حال لکھے۔(2)

مذکورہ بالا شواہد کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا چنداں دشوار نہیں کہ اردو زبان کی ساخت کا وہ بنیادی ڈھانچہ جو بعد ازاں دہلی اور دکن میں نکھر کر سامنے آیا، اس کا خمیر دراصل سندھ اور ملتان کی مٹی سے اٹھا تھا۔ عربوں نے یہاں کی بولیوں کو نہ صرف فارسی و عربی کے نئے ذخیرہ الفاظ سے ثروت مند کیا بلکہ اسے ایک ایسا بین الاقوامی تناظر بھی عطا کیا جس نے مستقبل میں اسے برصغیر کی لنگوا فرینکا بننے کے قابل بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ سندھی اور ملتانی زبانوں کے صرفی و نحوی ڈھانچے میں آج بھی اردو سے وہ گہری مشابہت نظر آتی ہے جو کسی اجنبی زبان میں ممکن نہیں۔ چنانچہ وادیِ سندھ کا یہ لسانی ورثہ اردو کی تاریخ کا وہ پہلا باب ہے جس نے اس عظیم الشان عمارت کی بنیاد رکھی جسے ہم آج اپنی قومی زبان کے طور پر جانتے ہیں۔ اردو کے ارتقائی سفر میں سندھ کا کردار محض ایک جائے پیدائش کا نہیں بلکہ اس ماں کا ہے جس نے اس زبان کو ابتدائی توانائی اور تہذیبی تشخص عطا کیا۔

اردو زبان کے ارتقائی سفر میں خطہِ پنجاب کی اہمیت محض ایک جغرافیائی علاقے کی نہیں بلکہ اس گہوارے کی ہے جہاں اس زبان نے اپنے تشکیلی دور کے تقریباً دو سو سال گزارے۔ تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ دہلی کی فتح سے قبل مسلمان فاتحین اور صوفیائے کرام کا طویل قیام پنجاب میں رہا، جس کے نتیجے میں مقامی پنجابی بولیوں اور فاتحین کی زبانوں کے مابین ایک گہرا لسانی تال میل پیدا ہوا۔ حافظ محمود شیرانی نے اسی تاریخی پس منظر کو بنیاد بنا کر یہ نظریہ پیش کیا کہ اردو دراصل پنجاب میں پیدا ہوئی اور یہیں سے اپنے صوتی و صرفی خدوخال لے کر دہلی روانہ ہوئی۔ ان کے نزدیک اس طویل عرصے کی بود و باش نے پنجابی کے اثرات کو اردو کے خمیر میں اس طرح حل کر دیا کہ دونوں زبانوں کے قواعد اور ذخیرہ الفاظ میں ایک ایسی حیرت انگیز مماثلت پیدا ہو گئی جو کسی اور علاقائی زبان میں نظر نہیں آتی۔ اس تاریخی و لسانی ضرورت کو امیر اللہ شاہین نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "مسلمان تقریباً پونے دو سو سال پنجاب میں رہے اس لیے لامحالہ اتنی طویل مدت میں روزمرہ ضروریات کی کفالت پنجابی نے کی ہو گی۔ پنجابی الفاظ، اصوات، لب و لہجہ، تذکیر و تانیث اور واحد جمع کے قاعدے سب کے سب پنجابی کے ہی برتے گئے ہوں گے۔"(3)

پنجاب اور اردو کے درمیان یہ صوتی اور نحوی رشتہ محض اتفاقی نہیں بلکہ ایک گہرے نامیاتی تعلق کا مظہر ہے۔ اگر ہم دونوں زبانوں کے مصادر کا جائزہ لیں تو "نا" کا لاحقہ (جیسے اٹھنا، بیٹھنا، کھانا) دونوں میں یکساں طور پر مستعمل ہے۔ اسی طرح تذکیر و تانیث کے اصول، اسمائے صفات کا "الف" پر ختم ہونا اور جمع بنانے کے طریقے اس قدر مماثل ہیں کہ ماہرینِ لسانیات اردو کو پنجابی کی ایک ترقی یافتہ شکل قرار دینے پر مجبور ہو گئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس رشتے کو مزید وسعت دیتے ہوئے یہ نکتہ اٹھایا کہ جب یہ زبان پنجاب سے نکل کر دکن اور گجرات پہنچی تو اس کے لہجے اور آہنگ پر پنجاب کی چھاپ اس قدر گہری تھی کہ وہاں کے قدیم ادبی نمونوں میں بھی پنجابی مزاج صاف جھلکتا ہے۔ پنجاب کے اسی کلیدی کردار پر ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ اقتباس نہایت اہمیت کا حامل ہے:

> "پنجاب اور اہل پنجاب سے اس زبان کا رشتہ ناتا روزِ اول ہی سے قائم ہے اور اہل پنجاب نے شروع ہی سے اس زبان کو بنانے سنوارنے میں حصہ لیا ہے۔ وہ زبان جو عبوری دور میں دہلی سے دکن، گجرات، مالوہ اور دوسرے صوبوں میں پہنچی، اس کی ساخت اس کے مزاج، لہجے اور آہنگ پر پنجاب ہی کا اثر سب سے زیادہ اور گہرا تھا۔"(4)

یہ صوتی مماثلت اور ساختی یگانگت ثابت کرتی ہے کہ اردو نے اپنی ابتدائی نشوونما کے لیے پنجاب کی مٹی سے توانائی حاصل کی۔ مسعود سعد سلمان جیسے شاعروں کے ہندوی دیوان اور بابا فرید گنج شکر کے کلام میں موجود لسانی نمونے اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ پنجاب وہ پہلی تجربہ گاہ تھی جہاں فارسی آمیز پنجابی نے اس زبان کی بنیاد رکھی جسے آج ہم اردو کے نام سے جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ایک عام پنجابی بولنے والے کے لیے اردو کا فہم اور اس کا تلفظ دیگر لسانی گروہوں کے مقابلے میں زیادہ سہل اور فطری معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ پنجاب کو اردو کی جنم بھومی قرار دینا محض ایک نظریہ نہیں بلکہ ان ٹھوس لسانی شواہد کا اعتراف ہے جو صدیوں کے ارتقائی عمل سے کشید کیے گئے ہیں۔ اس لسانی اشتراک نے نہ صرف اردو کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کی بلکہ اسے ایک ایسی ہمہ گیر زبان بنا دیا جو پورے برصغیر میں ابلاغ کا سب سے مؤثر ذریعہ بن کر ابھری۔

بلوچستان کا جغرافیائی وقوع اسے عرب، فارس اور برصغیر کے سنگم پر ایک ایسی تزویراتی حیثیت عطا کرتا ہے جہاں صدیوں سے مختلف تہذیبوں اور لسانی دھاروں کا ملاپ ہوتا رہا ہے۔ لسانی اعتبار سے یہ خطہ نہایت متنوع ہے، جہاں مہر گڑھ جیسی قدیم تہذیب کے آثار کے ساتھ ساتھ دراوڑی خاندان کی جڑیں براہوئی زبان کی صورت میں آج بھی موجود ہیں۔ اردو کی اس خطے میں "قدم بوسی" محض ایک بیرونی زبان کی آمد نہیں تھی بلکہ یہ ان مقامی لسانی ضرورتوں کا منطقی نتیجہ تھا جو مختلف قبائل کے مابین ابلاغ کے لیے ایک مشترکہ وسیلے کی متقاضی تھیں۔ ماہرینِ لسانیات کے ایک گروہ کا تو یہ بھی ماننا ہے کہ اردو کا ابتدائی ہیولیٰ مکران اور قلات کے ان علاقوں میں تیار ہوا جہاں

عرب فاتحین نے سندھ سے بھی پہلے قدم رکھا تھا۔ بلوچستان کا مخصوص سماجی ڈھانچہ اور یہاں کی زبانوں کا مزاج اردو کو قبول کرنے کے لیے فطری طور پر سازگار رہا ہے، جس کی وضاحت ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے ان الفاظ میں کی ہے:

"اہل بلوچستان کے لیے اردو زبان کی جانب مائل ہونا نہ صرف اس زبان کے بنیادی مزاج ہی کے باعث آسان نہ تھا بلکہ خود بلوچستان کا مزاج بھی لسانی تغیر کے لیے برصغیر میں سب سے زیادہ موزوں تھا۔۔۔ جنوبی اور مشرقی بلوچستان میں سندھی اور براہوی دونوں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ شمالی اور مشرقی بلوچستان میں سرائیکی اور پشتو تینوں بولی جاتی ہیں اور کوئٹہ جو بلوچستان کا مرکز ہے لسانی تنوع کا ایک دلچسپ اور حیرت انگیز منظر پیش کرتا ہے۔"(5)

تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ بلوچستان میں اردو کی جڑیں اتنی ہی گہری ہیں جتنی کہ یہاں کی دیگر قدیم زبانوں کی۔ بلوچی اور پشتو کے لسانی ڈھانچے کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں اوستائی اور قدیم ایرانی عناصر کی موجودگی انہیں اردو کی صوتیات سے قریب کرتی ہے۔ انیسویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے اردو یہاں کی علمی اور ادبی زندگی کا جزو بن چکی تھی۔ ملا محمد حسن جیسے شعراء کا کلیات، جو 1847ء میں مکمل ہوا، اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہاں کے اہل قلم اردو کے اسلوب اور شعری روایات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان پر مکمل قدرت رکھتے تھے۔ اردو نے یہاں ایک ایسی رابطے کی زبان کا کردار ادا کیا جس نے لسانی بعد کو ختم کر کے ایک مشترکہ فکری لہر پیدا کی۔ اس قدیم لسانی تعلق اور ایرانی السنہ کے اثرات پر ایم انور رومان کی رائے نہایت بصیرت افروز ہے:

"ایرانی یعنی وہ زبانیں جو ایرانِ باستان میں ظہور پذیر ہوئیں ان میں قدیم ترین اور سنسکرت کے ہم پلہ اوستائی زبان ہے۔۔۔ بلوچی اور پشتو ایرانی السنہ کے مرکزی یا وسطی حصوں سے تعلق نہیں رکھتیں بلکہ سرحدی علاقوں میں پیوست ہیں۔ لہٰذا ان میں اوستائی عنصر اب بھی زندہ اور پائیدار ہے جبکہ فارسی میں یہ عنصر ارتقاء کی شکل میں مل سکتا ہے۔"(6)

پاکستان کے قیام کے بعد بلوچستان میں اردو کے سفر نے ایک نیا رخ اختیار کیا، جہاں یہ محض ایک ادبی زبان سے بڑھ کر "وسیلہ اتحاد" بن گئی۔ مکران سے لے کر لورالائی تک، اردو نے اپنی لچکدار جبلت کے باعث مقامی محاورات اور لب و لہجے کو اپنے دامن میں سمیٹا، جس سے ایک مخصوص "بلوچستانی اردو" کا رنگ ابھرا۔ یہ زبان اب یہاں کے دفاتر، عدالتوں اور تعلیمی اداروں کی ضرورت بن چکی ہے، اور یہاں کے لوگ اسے اپنی ہی کسی علاقائی زبان کا تسلسل سمجھتے ہیں۔ اردو کی بلوچستان میں یہ مقبولیت ثابت کرتی ہے کہ یہ زبان کسی مخصوص علاقے کی اجارہ داری نہیں بلکہ پاکستان کے تمام خطوں کے مشترکہ تہذیبی خوابوں کی تعبیر ہے۔ اس طرح بلوچستان کا لسانی تناظر اردو کی ہمہ گیری اور اس کی آفاقیت کی ایک درخشاں مثال پیش کرتا ہے۔

صوبہ خیبر پختونخوا (قدیم اباسین) کی جغرافیائی اور سیاسی حیثیت برصغیر کی تاریخ میں ایک ایسے دروازے کی رہی ہے جہاں سے آنے والے فاتحین، علماء اور قبائل نے یہاں کے لسانی منظرنامے کو یکسر تبدیل کر دیا۔ پشتو اور اردو کا باہمی رشتہ محض ہمسائیگی کا نہیں بلکہ ایک گہرے تاریخی اور ساختی اشتراک کا مظہر ہے۔ ماہرینِ لسانیات کا ایک بڑا طبقہ اس بات پر متفق ہے کہ اردو کی تشکیل میں ان افغان قبائل کا بنیادی کردار ہے جو ایران اور وسطی ایشیاء سے ہوتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کی۔ یہ قبائل اپنے ساتھ فارسی، ترکی اور عربی کا جو ذخیرہ لائے، وہ پشتو کے صوتی سانچوں میں ڈھل کر اردو کے خمیر کا حصہ بن گیا۔ امتیاز علی خان عرشی جیسے محققین نے اس نکتے پر خاص زور دیا ہے کہ بہت سے الفاظ جو ہم اردو کے سمجھتے ہیں، وہ دراصل افغانی لب و لہجے کی وساطت سے ہم تک پہنچے ہیں۔ اس لسانی لین دین کی حقیقت کو امتیاز علی خان عرشی نے یوں بیان کیا ہے:

> "ہماری زبان میں بہت سے عربی فارسی اور ترکی لفظ اپنے اصل تلفظ سے ہٹ گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب تغیرات ہندی لہجے کا نتیجہ ہوں لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ افغانی بھی ان لفظوں کو بالکل ہمارے مطابق بولتے ہیں تو سوال یہ ابھرتا ہے کہ ہم نے ان کو ڈالا اور یہاں سے افغانستان بھیجا یا وہاں سے ڈھلے ڈھلائے ہم تک پہنچے۔" (7)

اردو اور پشتو کے اس تاریخی تعلق کا سب سے قدیم اور معتبر دستاویزی ثبوت پیر روشان بایزید انصاری کی تصنیف 'خیر البیان' (سولہویں صدی) میں ملتا ہے۔ اس کتاب کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں مذہبی حقائق کو بیک وقت چار زبانوں (عربی، فارسی، پشتو اور اردو) میں پیش کیا گیا ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ اس عہد میں بھی اردو اس خطے میں ایک ایسی رابطہ زبان کے طور پر موجود تھی جسے ہر طبقہ سمجھ سکتا تھا۔ پشتو کے عظیم شعراء خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا کے کلام میں ہندوی اور اردو الفاظ کی موجودگی اس رشتے کو مزید استحکام بخشتی ہے۔ یہ تعلق محض الفاظ کی حد تک محدود نہیں بلکہ 'چار بیت' جیسی اصنافِ سخن دونوں زبانوں میں مشترک ہیں۔ اردو ادب کی ترویج میں پشتون مصنفین اور شعراء کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے محققین نے انہیں "ہندوستانی پٹھان" کے لقب سے یاد کیا ہے، جس کی تفصیل بایزید انصاری کے کام کے حوالے سے یوں ملتی ہے:

> "پٹھانوں نے اردو زبان کی جو خدمات 'ہندوستانی پٹھان' بن کر انجام دی ہیں ان سے تاریخِ ادب کا مطالعہ کرنے والا بے خبر نہیں ہے۔۔۔ اردو نثر کا قدیم ترین نمونہ 'خیر البیان' مصنفہ بایزید انصاری میں ملتا ہے۔" (8)

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں قاسم علی خان آفریدی جیسے شعراء نے اردو دیوان مرتب کر کے اس لسانی رشتے کو ایک باقاعدہ ادبی روایت میں بدل دیا۔ خیبر پختونخوا کے کوہستانی علاقوں سے لے کر پشاور کے بازاروں تک اردو کا رواج دراصل اس ضرورت کا نتیجہ تھا جو مختلف بولیوں کے بولنے والوں کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے کے لیے درکار تھی۔ اس خطے نے اردو کو نہ صرف نئے الفاظ اور محاورات دیے بلکہ اسے ایک ایسا آہنگ اور لہجہ بھی عطا کیا جو اس کی ہمہ گیری کا ضامن بنا۔ چنانچہ پشتو اور اردو کا رشتہ ایک ایسی نامیاتی وحدت ہے جس نے صدیوں کے سفر میں ایک دوسرے کے فکری اور لسانی وجود کو جلا بخشی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اس صوبے میں اردو کو اجنبی زبان کے بجائے ایک قومی اور تہذیبی ورثے کے طور پر دیکھا جاتا ہے جس کی جڑیں یہاں کی تاریخ اور عوام کے جذبوں میں پیوست ہیں۔

کشمیر کے خطے میں اردو زبان کا نفوذ کسی اچانک سیاسی حادثے یا عسکری غلبے کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ یہ ایک طویل تہذیبی عمل اور تعلیمی ضرورتوں کے تحت وقوع پذیر ہوا۔ جغرافیائی اعتبار سے کشمیر کا پنجاب کے ساتھ قریبی رشتہ اور قدیم معاشی روابط وہ بنیادی محرکات تھے جنہوں نے اردو کے لیے وادی کے راستے ہموار کیے۔ اگرچہ ڈوگرہ راج کے ابتدائی دور میں فارسی کو سرکاری اور علمی زبان کی حیثیت حاصل تھی، لیکن عوامی سطح پر ابلاغ اور تجارتی لین دین کے لیے اردو کے الفاظ رفتہ رفتہ مقامی بولیوں، خصوصاً ڈوگری اور کشمیری میں جگہ بنا رہے تھے۔ اردو کی اس خطے میں آمد کی فطری اور پرامن صورتِ حال کو واضح کرتے ہوئے خواجہ غلام احمد پنڈت لکھتے ہیں:

> "اردو ریاست میں سر پر تاج پہن کر داخل ہوئی، نہ اس کی پشت پر کوئی لشکر تھا یہ بس سیاحوں خانقاہوں کے زائرین، تیرتھ یاتریوں یا علماء و مشائخ کے ساتھ آتی رہی۔"(9)

تعلیمی میدان میں اردو کی باقاعدہ سرپرستی مہاراجہ پرتاب سنگھ کے عہد میں شروع ہوئی، جب برطانوی اثر و رسوخ کے تحت ریاست میں جدید نظامِ تعلیم کی بنیاد رکھی گئی۔ اس مرحلے پر اردو کو پرائمری سطح پر ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا، جس نے لسانی اتحاد کی راہ ہموار کی۔ اس تعلیمی انقلاب کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے لیے اساتذہ کا انتخاب پنجاب کے شہروں سے کیا گیا، جس نے اردو کے معیاری لب و لہجے کو کشمیر میں منتقل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس تعلیمی و انتظامی منتقلی کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے سید محمود آزاد رقم طراز ہیں:

> "مہاراجہ پرتاب سنگھ کے زمانے میں برطانوی حکومت کے دباؤ پر مہاراجہ نے ریاست میں پرائمری اسکول قائم کیے تو ان اسکولوں میں اردو زبان میں تعلیم دی جاتی تھی۔۔۔ مقامی طور پر ایسے لوگ مسلمانوں میں موجود تھے جو تدریسی خدمات سرانجام دے سکیں اس کے

لیے مہاراجہ نے راولپنڈی، جہلم، گجرات، گجرانوالہ سے مسلمان اور ہندو اساتذہ بلوائے۔"
(10)

کشمیر میں اردو کی مقبولیت میں مذہبی اور سماجی تحریکوں کا بھی گراں قدر حصہ رہا ہے۔ اہلِ تشیع کی مجالس کے لیے لکھنؤ سے آنے والے ذاکرین اور وادی میں آنے والے مذہبی مبلغین نے اردو کو اپنے پیغام کی ترسیل کا واحد ذریعہ بنایا۔ چونکہ سری نگر اور جموں کے لسانی ماحول میں فرق تھا، اس لیے اردو ہی وہ واحد کڑی ثابت ہوئی جس نے وادی کے مختلف حصوں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔ اس طرح اردو محض ایک سرکاری زبان نہیں رہی بلکہ کشمیر کے سماجی ڈھانچے میں ایک ایسی ضرورت بن کر ابھری جس نے یہاں کے لوگوں کو برصغیر کے دیگر علمی و سیاسی دھاروں سے مربوط کر دیا۔ یہ تہذیبی سفر ثابت کرتا ہے کہ اردو نے کشمیر کی مٹی میں اپنی جڑیں کسی جبر کے بغیر پیوست کیں اور آج یہ زبان آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر دونوں طرف رابطے اور قومی تشخص کا سب سے بڑا استعارہ بن چکی ہے۔

اردو کی ہمہ گیریت کا ایک منفرد پہلو یہ ہے کہ اس نے برصغیر کی مختلف لسانی روایات کو ایک معنوی مرکز پر جمع کر دیا ہے۔ اگرچہ لسانیات کی روایتی تقسیم میں اردو کو ہند آریائی خاندان کی شاخ تسلیم کیا جاتا ہے، تاہم گہرا تحقیقی مطالعہ اسے آریائی اور غیر آریائی (دراوڑی) خاندانوں کا ایک ایسا سنگم ثابت کرتا ہے جہاں قدیم ہند کی تمام لسانی جڑیں آپس میں پیوست نظر آتی ہیں۔ یہ نظریہ اردو کو محض ایک لشکری یا فاتحین کی زبان کے بجائے اس سرزمین کے قدیم ترین تمدنی ورثے کا تسلسل قرار دیتا ہے۔ اردو کا کمال یہ ہے کہ اس نے ان دونوں متضاد لسانی دھاروں کے مابین ایک ایسی نامیاتی وحدت پیدا کی ہے جو پاکستان کے تمام جغرافیائی خطوں کے لیے یکساں طور پر مانوس ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے برصغیر کی زبانوں کی اس خاندانی تقسیم اور ان کے باہمی اشتراک کے پس منظر کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

> "ہند و پاک کی زبانیں دو خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ جنوبی ہند کی تلگو، ملیالم، کنڑی اور تامل دراوڑ گروہ میں شامل ہیں۔ کول، سنتھال، گونڈ، منڈل، منڈا گروہ ہیں۔ یہ سب تورانی خاندان سے ہیں۔ بقیہ زبانیں ہند ایرانی خاندان کی ہیں جو مل جل کر ہند آریائی گھرانے کی تشکیل کرتی ہیں۔"(11)

اس لسانی ملاپ کی عملی صورت اس وقت مزید نکھر کر سامنے آتی ہے جب ہم اردو کے ذخیرہ الفاظ کا موازنہ پاکستان کی علاقائی زبانوں سے کرتے ہیں۔ بلوچستان کی براہوئی زبان، جو اپنی ساخت میں دراوڑی ہے، اور پنجاب و سندھ کی آریائی زبانوں کے مابین اردو ایک مشترک فکری پل کا کردار ادا کرتی ہے۔ اردو نے ان تمام لسانی خاندانوں سے الفاظ، محاورات اور علامات مستعار لے کر ایک ایسی لغت تشکیل دی ہے جو ہر علاقے کے باسی کے لیے ابلاغ کی سہولت فراہم کرتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تحقیقی کاوشوں کے ذریعے ان

ہزاروں مشترک الفاظ کی بازیافت کی ہے جو اردو اور علاقائی زبانوں کے گہرے رشتے کی گواہی دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک لغت سازی کا یہ عمل دراصل لسانی دوریوں کو ختم کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے:

"آپ کو اس لغت میں ہزاروں الفاظ ملیں گے جو پاکستان کی علاقائی زبانوں میں آج بھی زندہ اور مستعمل ہیں اور یقیناً ہمیں دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ ان الفاظ کو دوبارہ اپنی تحریروں میں استعمال کر کے اردو کو علاقائی زبانوں سے اور علاقائی زبانوں کو اردو سے قریب تر لایا جائے۔"(12)

اردو کی یہ تمدنی بوطیقا ثابت کرتی ہے کہ یہ زبان محض کسی ایک نسلی گروہ کی میراث نہیں بلکہ ایک ایسا لسانی میثاق ہے جس نے صدیوں کے ارتقائی سفر میں دراوڑی خاندان کی قدیم گہرائی اور آریائی خاندان کی فکری وسعت کو یکجا کر دیا ہے۔ یہی وہ سنگم ہے جہاں سے "پاکستانیت" کا وہ متفقہ لسانی شعور جنم لیتا ہے جو صوبائی تعصبات سے بالاتر ہو کر ایک قومی اکائی کی تشکیل کرتا ہے۔ اردو کی یہ صلاحیت کہ وہ مختلف خاندانوں کی آوازوں اور اصولوں کو اپنے اندر جذب کر کے ایک نیا آہنگ پیدا کر سکے، اسے ایک ایسی آفاقی لنگوا فرینکا بناتی ہے جو ماضی کے ورثے اور حال کے تقاضوں کے درمیان ایک مضبوط تاریخی کڑی ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح اردو کا مشترک لسانی ورثہ پاکستان کے تمام خطوں کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے اور قومی یکجہتی کو مستحکم کرنے کا ضامن بن جاتا ہے۔

اردو زبان کی مقبولیت اور اس کی ہمہ گیر وسعت کے پس پردہ جس طبقے کی جدوجہد سب سے زیادہ نمایاں ہے، وہ صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین ہیں۔ ان اہل اللہ نے زبان کو محض ابلاغ کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ اسے محبت، رواداری اور انسانیت کے عالمگیر پیغام کی ترسیل کا ایک مقدس وسیلہ بنایا۔ جس دور میں علمائے وقت درباروں کی فارسی اور پنڈت مندروں کی سنسکرت تک محدود تھے، صوفیاء نے عوامی رابطے کے لیے "ہندوی" یا قدیم اردو کو اختیار کیا۔ ان بزرگوں نے عوامی بولیوں کو تصوف کی باریکیوں اور باطنی واردات کے اظہار کے قابل بنایا، جس سے زبان میں ایک ایسی گہرائی پیدا ہوئی جو آگے چل کر اردو شاعری اور نثر کی پہچان بن گئی۔ صوفیائے کرام کی اسی لسانی بصیرت اور تبلیغی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں:

"صوفیائے کرام نے تبلیغِ دین کے لیے اسی زبان کو ذریعہ اظہار بنایا اور اسے ادبی سطح پر لانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔"(13)

صوفیاء کا لسانی کردار صرف الفاظ کی منتقلی تک محدود نہیں تھا بلکہ انہوں نے اردو کے رگ و پے میں اسلامی فکر اور مشرقی اقدار کو اس طرح پرو دیا کہ یہ زبان برصغیر کے مسلمانوں کی ایک مضبوط روحانی شناخت بن گئی۔ سندھ میں شاہ عبداللطیف بھٹائی، پنجاب میں بابا

فرید گنج شکر، خیبر پختونخوا میں پیر روشان اور دکن میں میراں جی شمس العشاق نے جس زبان میں اپنے عارفانہ خیالات پیش کیے، وہ دراصل اردو کی وہ ابتدائی شکل تھی جس نے علاقائی تعصبات کی دیواریں گرا کر دلوں کو جوڑنے کا کام کیا۔ ان بزرگوں کی برکت سے اردو کا دامن نہ صرف لغوی طور پر وسیع ہوا بلکہ اس میں وہ حجازی تمدن اور تہذیب رچ بس گئی جو اسے دیگر زبانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس تہذیبی اور دینی جڑت کو واضح کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"ہمیں سندھ اس لیے عزیز ہے کہ برصغیر میں سب سے پہلے اسی سرزمین میں اسلام کی روشنی پہنچی۔۔۔ اور ہماری یہ قومی زبان اردو اسی تہذیب و ثقافت کا شاہکار ہے اور اسی کی زندہ و جاوید یادگار ہے۔"(14)

اردو زبان کے اس صوفیانہ مزاج نے اسے ایک ایسی "رابطہ زبان" میں بدل دیا جس کی بنیاد نفرت یا سیاسی غلبے پر نہیں بلکہ الفت اور یگانگت پر استوار تھی۔ صوفیاء کی بدولت ہی یہ زبان خانقاہوں کی روحانی فضاؤں سے نکل کر عام بازاروں اور گھروں تک پہنچی اور ہر مکتبہ فکر کے لیے قابلِ فہم ٹھہری۔ آج اگر پاکستان کے تمام صوبوں میں اردو اتحاد کا سب سے بڑا نشان ہے، تو اس کی اصل وجہ وہی باطنی آبیاری ہے جو صدیوں تک ان بزرگوں نے اپنے اخلاق اور کلام کے ذریعے انجام دی۔ یہی وہ میراث ہے جو اردو کو محض ایک زبان نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر ضابطۂ حیات اور ابلاغِ محبت کا استعارہ بناتی ہے۔

پاکستان کی لسانی تاریخ میں قومی یکجہتی کا خواب اس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک وفاق کی علامت کے طور پر ایک ایسی زبان موجود نہ ہو جو تمام اکائیوں کو جوڑنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اردو زبان نے اپنی فطری لچک اور وسعت کی بنا پر ہمیشہ یہ فریضہ سرانجام دیا ہے۔ اس مقصد کے لیے ریاستی سطح پر 14 اکتوبر 1979ء کو "مقتدرہ قومی زبان" کا قیام عمل میں لایا گیا، جس کا بنیادی نصب العین اردو کے فروغ اور نفاذ کے ذریعے قومی ہم آہنگی کو مستحکم کرنا تھا۔ مقتدرہ نے محض اردو کی ترویج ہی نہیں کی بلکہ اس حقیقت کو بھی اجاگر کیا کہ پاکستان کی علاقائی زبانیں اردو کی حریف نہیں بلکہ اس کی جڑیں ہیں جو اس سرزمین میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس ادارے نے ایک ایسی منصوبہ بندی کے تحت کام کیا جس میں صوبائی زبانوں کی یگانگت اور مشترکہ ذخیرہ الفاظ کو منظرِ عام پر لا کر لسانی بعد کو ختم کیا گیا۔

قومی اتحاد کے تناظر میں اردو کی اہمیت اس لیے بھی مسلم ہے کہ یہ کسی ایک صوبے کے دوسرے پر غلبے کا احساس پیدا نہیں کرتی، بلکہ یہ ایک ایسا تمدنی سنگم ہے جہاں سندھی، پنجابی، پشتو اور بلوچی کے دھارے مل کر ایک متفقہ "پاکستانیت" کی تشکیل کرتے ہیں۔ پروفیسر فتح محمد ملک نے مقتدرہ کے پلیٹ فارم سے اسی تصور کو عام کیا کہ پاکستان کا ہر خطہ اردو کو اپنی ہی تہذیب کا تسلسل سمجھتا ہے۔ ان کے

نزدیک اردو کا نفاذ دراصل ان لسانی جڑوں کی آبیاری ہے جو ملک کے تمام حصوں میں مشترک ہیں۔ مقتدرہ کی ان مساعی کے ثمرات کو بیان کرتے ہوئے پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

> "یہ حقیقت بڑی خوش آئند ہے کہ سندھ، بلوچستان، پنجاب، اباسین اور کشمیر کے ماہرین لسانیات اردو کی پیدائش اور ابتدائی نشو و نما اپنے فوری گرد و پیش میں دیکھتے ہیں۔۔۔ پاکستان کا ہر صوبہ قومی زبان اردو کو اپنی ہی زبانوں سے پھوٹنے والی ایک زبان قرار دیتا ہے۔ یہ پاکستان کے تہذیبی مستقبل کے لیے ایک بے حد نیک شگون ہے۔"(15)

مقتدرہ قومی زبان نے نفاذِ اردو کے سلسلے میں جو علمی و تحقیقی مواد فراہم کیا، اس نے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا کہ اردو کسی مخصوص طبقے یا علاقے کی زبان ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے نزدیک اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ ایک تہذیب ہے جس میں برِ عظیم کے مسلمانوں کی دینی اور سماجی روح شامل ہے۔ اردو کا نفاذ دراصل اس قومی شناخت کا تحفظ ہے جس کے لیے تحریکِ پاکستان برپا ہوئی تھی۔ اگرچہ نفاذ کی راہ میں بعض سیاسی و انتظامی مصلحتیں حائل رہی ہیں، مگر مقتدرہ نے مسلسل یہ باور کرایا ہے کہ وفاق کی مضبوطی کا راز قومی زبان کے استحکام میں پنہاں ہے۔ اردو کے اسی وفاقی کردار اور قومی ضرورت پر زور دیتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی رقم طراز ہیں:

> "ہماری قومی زبان ہمارے وفاق کی علامت ہے، ہماری قومی شناخت ہے، قومی سطح پر ہماری ضرورت ہے، اس کے بغیر ہم انگریزی کے ذریعے عوام تک نہیں پہنچ سکتے۔"(16)

ادارے کی ان کوششوں کا ایک اہم پہلو یہ بھی رہا ہے کہ اس نے جدید مشینی تقاضوں کے مطابق اردو کو ڈھالنے کے لیے ٹائپ، کمپیوٹر فانٹس اور دفتری اصطلاحات کی معیار بندی کی۔ اس سائنسی منہج نے اردو کو اس قابل بنایا کہ وہ جدید دنیا کے چیلنجز کا مقابلہ کر سکے۔ مقتدرہ قومی زبان کی یہ مساعی ثابت کرتی ہیں کہ اردو محض جذبات کی زبان نہیں بلکہ ایک ایسی فعال اور ترقی یافتہ علمی بنیاد رکھتی ہے جو پاکستان کی ہمہ گیر ترقی اور صوبائی یگانگت کی ضامن بن سکتی ہے۔ چنانچہ اردو کا ہر سطح پر نفاذ دراصل ان تمام علاقائی بولیوں کو ایک مرکز پر اکٹھا کرنا ہے جو ہماری مشترکہ تمدنی وراثت کا حصہ ہیں، اور یہی وہ راستہ ہے جو پاکستان کو ایک مضبوط اور متحد قوم کے طور پر عالمی نقشے پر مستحکم کر سکتا ہے۔

ماحصل:

اس تفصیلی مطالعے کا ماحصل یہ ہے کہ اردو زبان پاکستان کے تمام صوبوں اور خطوں کے مابین محض ایک رسمی زبان نہیں بلکہ اتحاد و یگانگت کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ سندھ، پنجاب، بلوچستان، خیبر پختونخوا اور کشمیر کے لسانی روابط ثابت کرتے ہیں کہ اردو نے ہر

علاقے کی مٹی سے توانائی حاصل کی اور بدلے میں انہیں ایک مشترکہ قومی شناخت عطا کی۔ یہ زبان پاکستان کے کثیر لسانی معاشرے میں "عادِ اعظم مشترک" کی حیثیت رکھتی ہے، جس نے صدیوں کے ارتقائی سفر میں صوفیاء، شعراء اور عام عوام کے جذبوں کو یکجا کیا ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اردو اور علاقائی زبانوں کے مابین کوئی حقیقی رقیبانہ رشتہ نہیں ہے بلکہ ان کا لسانی خاندان اور ذخیرہ الفاظ ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ اردو کی لچکدار جبلت نے اسے اس قابل بنایا ہے کہ وہ جدید ٹیکنالوجی اور سماجی تبدیلیوں کو جذب کرتے ہوئے بھی اپنا قومی تشخص برقرار رکھے۔ پاکستان کی سالمیت اور استحکام کے لیے اردو کا نفاذ اور اس کے ذریعے تمام صوبوں کے مابین علمی و ادبی داد و ستد کو بڑھانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

حوالہ جات

1. سید سلیمان ندوی، نقوشِ سلیمانی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، 1967ء، ص31
2. بزرگ بن شہریار، عجائب الہند، بحوالہ سید سلیمان ندوی، نقوشِ سلیمانی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، 1967ء، ص59
3. امیر اللہ شاہین، جدید اردو لسانیات، چغتائی پبلشرز، میرٹھ، 1973ء، ص61
4. جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اول، مجلس ترقی ادب لاہور، 2005ء، ص22-23
5. انعام الحق کوثر، بلوچستان میں اردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1987ء، ص7-8
6. ایم انور رومان، بلوچستان میں اردو ذریعہ تعلیم، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1987ء، ص37-38
7. امتیاز علی خان عرشی، اردو زبان کی بناوٹ میں پشتو کا حصہ، کتاب منزل، لاہور، س۔ن، ص339
8. بایزید انصاری، خیر البیان، مرتبہ: حافظ محمد عبد القدوس قاسمی، پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی، 1967ء، ص1
9. خواجہ غلام احمد پنڈت، اوراق پارینہ (کشمیریات)، سنگم پبلی کیشنز، مظفر آباد، ص178
10. سید محمود آزاد، تاریخِ کشمیر، جلد دوم، سیارت پبلی کیشنز، مظفر آباد، 1992ء، ص127
11. ڈاکٹر شوکت سبزواری، داستان زبان اردو، انجمن ترقی اردو کراچی، 1960ء، ص10
12. ڈاکٹر جمیل جالبی، قدیم اردو کی لغت، مرکزی اردو بورڈ لاہور، 1973ء، ص7
13. ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخِ ادبِ اردو، جلد اول، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، 1975ء، ص17
14. عبادت بریلوی (مرتبہ)، خطباتِ عبد الحق، انجمن ترقی اردو، کراچی، 1964ء، ص106

15. فتح محمد ملک، پاکستان میں اردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2006ء، ص 1

16. جمیل جالبی، قومی زبان: یک جہتی، نفاذ اور مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1989ء، ص 2

References:

1. Syed Suleman Nadvi, Nuqoosh-e-Sulemani, Urdu Academy Sindh, Karachi, 1967, p. 31.
2. Buzurg bin Shahryar, Ajaib-ul-Hind, bawasita Syed Suleman Nadvi, Nuqoosh-e-Sulemani, Urdu Academy Sindh, Karachi, 1967, p. 59.
3. Ameerullah Shaheen, Jadeed Urdu Lisaniyat, Chughtai Publishers, Meerut, 1973, p. 61.
4. Jameel Jalibi, Tareekh-e-Adab-e-Urdu, Jild Awwal, Majlis-e-Taraqqi-e-Adab, Lahore, 2005, pp. 22–23.
5. In‘aam-ul-Haq Kausar, Balochistan Mein Urdu, Muqtadra Qaumi Zaban, Islamabad, 1987, pp. 7–8.
6. M. Anwar Roman, Balochistan Mein Urdu Zariya-e-Taleem, Muqtadra Qaumi Zaban, Islamabad, 1987, pp. 37–38.
7. Imtiaz Ali Khan Arshi, Urdu Zaban ki Banaawat Mein Pashto ka Hissa, Kitab Manzil, Lahore, s.n., p. 339.
8. Bayazid Ansari, Khair-ul-Bayan, murattib: Hafiz Muhammad Abdul Quddus Qasmi, Pashto Academy, University of Peshawar, 1967, p. 1.
9. Khwaja Ghulam Ahmad Pandit, Auraq-e-Parina (Kashmiriyat), Sangam Publications, Muzaffarabad, p. 178.
10. Syed Mahmood Azad, Tareekh-e-Kashmir, Jild Doem, Sayarat Publishers, Muzaffarabad, 1992, p. 127.
11. Dr. Shaukat Sabzwari, Dastan-e-Zaban-e-Urdu, Anjuman Taraqqi Urdu, Karachi, 1960, p. 10.
12. Dr. Jameel Jalibi, Qadeem Urdu ki Lughat, Markazi Urdu Board, Lahore, 1973, p. 7.
13. Dr. Jameel Jalibi, Tareekh-e-Adab-e-Urdu, Jild Awwal, Majlis-e-Taraqqi-e-Adab, Lahore, 1975, p. 17.
14. Ibadat Barelvi (murattib), Khutbat-e-Abdul Haq, Anjuman Taraqqi Urdu, Karachi, 1964, p. 106.
15. Fateh Muhammad Malik, Pakistan Mein Urdu, Muqtadra Qaumi Zaban, Islamabad, 2006, p. 1.
16. Jameel Jalibi, Qaumi Zaban: Yakjehti, Nafaz aur Masail, Muqtadra Qaumi Zaban, Islamabad, 1989, p. 2.